حبیب اشعؔر

میری عمر کا دسواں برس شروع ہو چکا تھا کہ یکا یک ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا جسے یرقان کہتے ہیں اور چند دن کے اندر اندر بتاشے کی طرح گھل گیا۔ کئی ڈاکٹروں اور طبیبوں کا علاج ہوا مگر حالت بگڑتی چلی گئی۔ آخر والد نے کہا:

میں اسے حکیم کیفؔ کے پاس لیے جاتا ہوں۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے اور یہاں لاہور میں اُن کے سوا میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔

والدہ مرحومہ نے مجھے تانگے میں ڈالا اور تانگے والے کو شاہی محلے چلنے کی ہدایت کی۔ حکیم صاحب کا مطب مکان کی نچلی منزل میں تھا۔ کمرہ چھوٹا لیکن نہایت نفاست سے سجا ہوا اور صاف ستھرا۔ فرش پر عمدہ قالین بچھا تھا۔ پاندان بھی موجود تھا اور اُگال دان بھی اور دونوں چیزیں ایسی نئی اور چمک دار جیسے ابھی ابھی بازار سے لا کر رکھی گئی ہیں۔ حکیم صاحب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ سامنے لکڑی کا ایک خوب صورت صندوقچہ دھرا تھا۔ حکیم صاحب کے دائیں بائیں گوشت پوست کی بنی ہوئی دو کچی کلیاں ناز و انداز سے بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

غنچہ دہن، گل پیرہن
ایک اس طرف ایک اس طرف

والد کو دیکھتے ہی حکیم صاحب کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ انہوں نے اُٹھ کر معانقہ کیا اور خیر و عافیت پوچھی۔ پھر میری طرف توجہ کی۔ نبض پر ہاتھ رکھا اور بڑے شفیق لہجے میں چند باتیں پوچھیں۔ ایک نسخہ تجویز کیا، کچھ پرہیز بتایا۔ دوا بھی اپنے پاس سے دی۔ والد کو چائے اور مجھے خوشبودار شربت پلایا۔ تھوڑی دیر شعر و شاعری ہوئی اور والد مجھے لے کر چلے آئے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر حکیم صاحب کے علاج سے میری حالت سنبھل گئی۔ اس دوران میں کئی بار حکیم صاحب کے مطب میں جانا ہوا اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ کوئی نہ کوئی حورِ وَش دل بہلانے کو موجود ہے۔

انہی حکیم صاحب کے مطب میں ایک جوانِ رعنا کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اخلاق و شرافت کا ایک حسین پیکر۔ اُن میں اور میرے والد میں سلام اور دعا کے بعد اگر کوئی بات ہوتی تو شعر و شاعری کی۔ وہ انہیں اپنا کلام سناتے اور یہ اُنہیں.......وہ ان کے کسی شعر پر سر دھنتے اور یہ اُن کے شعر پر وجد کرتے اور میں ان دونوں کا باری باری منہ تکا کرتا۔ ان صاحب کا قد میانہ، آواز میں کسی قدر کھنک، سرخ و سپید چہرے پر نازک سی سنہری کمانیوں کی عینک جس کے شیشے بے حد صاف ہوتے تھے۔ اور ان شیشوں کے پیچھے سے ان کی روشن آنکھیں برابر مسکرائے جاتی تھیں۔ والد نے مجھے بتایا کہ یہ حکیم کیف کے چھوٹے بھائی حکیم حبیب اشعر ہیں۔

حبیب اشعر کے چہرے پر اُن دنوں جیسی تروتازگی اور جاذبیت میں نے پائی ویسی تروتازگی اور جاذبیت بہت کم لوگوں کے چہرے پر دیکھنے میں آئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انہی دنوں انہوں نے باتوں باتوں میں والد سے ذکر کیا تھا کہ وہ آج کل قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ وہ تفسیر غالباً ادھوری رہ گئی ورنہ سامنے ضرور آتی۔

۱۹۵۰ء میں والد [۱] نے رحلت کی۔ دو شخص لاہور شہر میں ایسے تھے جو تعزیت کے لیے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ایک خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی اور دوسرے حبیب اشعر صاحب۔ دونوں اپنے مرحوم دوست کو یاد کر کے دیر تک آب دیدہ رہے۔ یہ تھی ان کی دوستی اور یہ تھی ان کی محبت اور یہ تھی اُن کی وضع داری جسے یاد کر کے آج میں خون کے آنسو روتا ہوں۔

اب کچھ تھوڑا سا ذکر حکیم کیف کا ہو جائے کہ میں حبیب اشعر سے کیفؔ کو الگ نہیں کر سکتا۔

حکیم ہاشم جان کیف کو میں نے اول اول ۱۹۴۹ء کے اواخر میں دیکھا تھا اور جس عالم میں دیکھا، وہ بیان کر چکا ہوں۔ بچپن کی وہ یادیں اتنی مربوط اور زیادہ روشن بھی نہیں تاہم کیف کی دل آویز شخصیت کا ایک نقش میرے ذہن پر مستقلاً بیٹھ گیا۔ مرحوم شاہد احمد دہلوی نے کیف کو پہلی بار ۱۹۳۰ء میں دلی کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ اُن کا بیان ہے کہ کیف کی عمر اُس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ عجب طرح دار نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، ستواں ناک، ہونٹ گلاب کی پتیاں جن پر کثرت پان خوری کے باعث لاکھے کی

ہلکی سی تحریر، مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بوٹا سا قد، سر پر ترکی ٹوپی، سیاہ فراک کوٹ چست پاجامہ، نصف ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ چال میں البیلا پن۔ باتوں میں لگاوٹ......سب کی نظریں اسی طرح دار نوجوان پر پڑ رہی تھیں۔

میں نے بھی اسے دیکھا تو کسی سے پوچھا: یہ کون صاحبزادے ہیں؟ بتایا گیا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے نواسے ہیں، طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ گھنٹے پون گھنٹے کے بعد کیفؔ کی باری آئی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ ریشمیں سے صاحبزادے پھسڈی آئیں گے اور ان کی بڑی ٹھُڑی ٹھُڑی ہوگی مگر جب کیفؔ نے مطلع پڑھا تو مشاعرہ چمک اُٹھا۔ دل کش ترنم، پاٹ دار آواز، موزوں زیر و بم، عمدہ شعر......وہ جم کر پڑھا کہ لطف آ گیا۔ بار بار شعر مکرر پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھی اور کیف کی آواز کی توانائی بڑھتی جاتی تھی۔ جب غزل ختم ہوگئی تو چاروں طرف سے ماشاءاللہ اور سبحان اللہ کی بارش ہو رہی تھی۔ کیفؔ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس کے بعد کئی شاعروں نے پڑھا، مگر کسی کا رنگ نہ جم سکا اور سب کے سب ٹھیکرے سے توڑ کر چلے گئے۔

کیفؔ کی شاعری کا سلسلہ دو چار سال چلا۔ اس کے بعد انہوں نے شاعری چھوڑ کر مطب کرنا شروع کر دیا۔ کیفؔ بہت اچھے طبیب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی مگر انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اپنے پیشے کی طرف توجہ نہ دی۔ مزاج میں لا اُبالی پن تھا۔ جم کر مطب کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ گھر کے رئیس تھے اور دلی کے سارے ہی حکیم رئیس ہوتے تھے اس لیے اور بھی لاپروا ہو گئے تھے۔ ویسے جب واقعی کسی کا علاج کرتے تو معجزے بھی کر دکھاتے ورنہ یہ بھی دیکھا ہے کہ ٹالنے کے لیے نل میں سے بوتل میں پانی بھر کر مریض کو پکڑا دیا اور اللہ کی شان اسی سے بیمار اچھا ہو گیا۔

کیفؔ پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ حسین آدمی۔ ہوا خواہوں کی کمی نہ تھی۔ بالا خانوں پر رسائی اور پذیرائی ہونے لگی۔ وہ تو کہو والدین زندہ تھے اور جائے داد کیف کے قبضے میں نہیں آئی تھی ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے سب خالصے لگ جاتا۔

مطب سے جو کچھ کماتے اور ہزاروں ہی کماتے، سب اسی عیاشی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی یہ موٹی آمدنی رئیسوں کے لیے نسخہ خاص تیار کرنے سے ہوتی تھی۔ خود حکیم صاحب

دونوں ہاتھوں سے جوانی لٹاتے تھے۔ چاوڑی میں حکیم صاحب کی دھوم مچی رہتی تھی۔ فخر یہ فرماتے تھے کہ لیلیٰ قیس قیس پکارتی تھی، طوائفیں کیف کیف پکارتی پھرتی ہیں۔ چند بار انہیں سمجھایا بھی کہ میاں اتنے بھاگ کرمت چلو کہ ٹھوکر لگے تو پڑے کے پڑے رہ جاؤ، مگر جوانی دیوانی بھلا کب مانتی تھی۔ جب تک تندرستی رہی یہی لیل ونہار رہے۔ پھر وہ وقت آ گیا جب ان دونوں سروں سے جلتی ہوتی شمع کا رشتۂ حیات منقطع ہونے لگا۔

۱۹۶۰ء میں مجھے کیفؔ سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ وہ بہت بیمار تھے مگر ان کی طبیعت کی جولانی اور زبان کی روانی بدستور قائم تھی۔ اس مری ہوئی حالت میں بھی ایک طوائف جناب کی ملازم تھی۔ میں نے کہا:

اب تو تائب ہو جاؤ، انشاءاللہ اچھے ہو جاؤ گے۔

بولے: آ کا! مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے۔

اُن کے چھوٹے بھائی میاں حبیب اشعر نے بڑی سعادت مندی سے ان کی خدمت کی۔ بہترین یونانی اور ڈاکٹر علاج کرائے، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اور ایک دن شاہد صاحب نے سن لیا کہ وہ ہاشم جان کیفؔ .... وہ طرح دار نوجوان .... موت کی آغوش میں میٹھی نیند سو گیا۔ گویا عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

مرنے سے چند برس پہلے، جب وہ تندرست تھے، جمعرات کے جمعرات حکیم کیفؔ حضرت پیر مکی اور حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جایا کرتے تھے۔ ہمارا گھر اُن دنوں پیر مکی میں تھا اور میں ہر جمعرات کی سہ پہر اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا ہو کر حکیم کیفؔ کی آمد کا انتظار کرتا۔ وہ ٹھیک وقت پر آتے۔ سفید شیروانی، چست پاجامہ، پیروں میں سلیم شاہی، منہ میں پان، شیروانی کے نچلے بٹن ہمیشہ کھلے رہتے، گردن جھکائے، چپکے چپکے کچھ پڑھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے گزر جاتے۔ راہ چلتے آنکھ اُٹھانا گویا ان کے لیے حرام تھا۔ میں ہمیشہ آگے بڑھ کر سلام کرتا اور وہ اُسی طرح گردن جھکائے اور آنکھ اُٹھائے بغیر ہاتھ کی جنبش سے سلام کا جواب دیتے ہوئے نکل جاتے۔ بندۂ خدا نے ایک بار بھی یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ سلام کرنے والا کون ہے کون نہیں .... مجھے ہمیشہ ان کی اس ادا

پر پیار آتا تھا۔

میں جب بھی حکیم کیفؔ اور ان کے بھائی حبیب اشعر کا تصور کرتا ہوں مجھے ان دونوں میں حسن و عشق، جلال و جمال، غم دوراں غم جاناں اور تعمیر و تخریب کا ایک عجیب امتزاج نظر آتا ہے۔ خود حسن و عشق دونوں میں جمال کے ساتھ ساتھ جلال کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ جمال میں صرف تعمیر ہے۔ جلال میں تخریب بھی ہے تعمیر بھی .... جلال اور تعمیر کے حسین تاج محل، اجنتا اور ایلورا کے غار، بابل کے معلق باغ، مصر کے اہرام، قرطبہ کی مسجد اور الحمرا کو جنم دیتا ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ پوری کائنات کو پھونک ڈالنے کے لیے اپنا سر اُٹھاتا ہے۔ عرفی شیرازی نے جلالِ قدرت کو طغیانِ ناز سے کتنی حسین تشبیہ دی ہے۔

طغیانِ ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
سر زیرِ تیغ داد و شہیدش نمی کنند

پاکستان آجانے کے فوراً بعد سے زندگی کے آخری سانس تک کیا حبیب اشعر عرفی کے اس شعر کی تفسیر نہیں بنے رہے؟

عین ممکن تھا کہ حبیب اشعر بھی اپنے بڑے بھائی ہاشم جان کیفؔ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے جوانی لٹا دیتے لیکن اللہ میاں کو ان کی کوئی جلالی یا جمالی ادا ایسی پسند آئی کہ انہیں ایک ایسے شخص کے پاس بھیج دیا جو خود جلال و جمال اور فضل و کمال کی تصویر تھا۔

''یادوں کی برات'' میں جوشؔ صاحب نے مولوی عبدالسلام نیازی دہلوی کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ: ''وہ مشرقی علوم کے حرفِ آخر انسان اور شہنشاہ تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، ادب اور شاعری کے امام تھے۔''

یہ حبیب اشعر کی زندگی کا سب سے نازک لیکن سب سے حسین دور تھا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب اُن سے میری ایک ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں مولوی عبدالسلام نیازی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ جی چاہتا ہے آپ کو بھی حکیم حبیب اشعر کی زبانی یہ واقعہ سنواؤں:

''۱۹۳۷ء کی بات ہے، مئی یا جون کا مہینہ تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کے گھر سے

نکلا اور سورج کے آتشیں تیروں سے بچتا، کونے کونے، سائے سائے میں جامع مسجد کی طرف روانہ ہوگیا جہاں حافظ ہوٹل میں روزانہ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے بیٹھنا، بے تکلف دوستوں کی صحبت میں چائے کی پیالیاں لنڈھانا، ان کے شعر سننا اور اپنے شعر سنانا میرا معمول تھا۔ قاضی کے حوض کے سامنے چاوڑی کے موڑ سے دو چار دکانیں اِدھر ایک سبیل تھی اور اس سبیل کے پہلو میں ننوا تیلی کی دکان۔ دکان کے آگے تھڑے سے بالکل ملا ہوا ایک تخت بچھا رہتا تھا۔ اس تخت پر ایک چھوٹی سی مسند پر بیٹھے، گاؤ تکیے کی ٹیک لگائے ننوا تیلی صاحب اس طرح دکان داری کرتے تھے جیسے کوئی راجہ دربار کر رہا ہو۔ جب میں اس دکان کے قریب پہنچا تو ٹاٹ کا پردہ دھوپ سے بچاؤ کے لیے دو بانسوں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا تھا اور تخت پر ننوا تیلی کے پہلو میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ گیہواں رنگ، دوہرا گٹھا ہوا کسرتی جسم، ڈاڑھی اور مونچھوں کے بل صاف، چہرے پر علم و فضل کا وقار، آنکھوں میں جودت و ذہانت کی چمک، گلے میں چکن کا کرتا اس پر نہرو کٹ سے ملتی جلتی تراش کی تسر کی صدری، ٹانگوں میں تنگ مُوری کا چوڑی دار سیدھا پاجامہ، گود میں سرخ رنگ کا چھپا ہوا انگوچھا...... یہ دلی کے مشہور صوفی اور معقولی بزرگ مولانا عبدالسلام نیازی تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے مولانا کو سلام کیا اور اپنے قدم ذرا تیز کر دیے، لیکن میں گز دو گز ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک بھاری بھرکم آواز آئی:

''میاں صاحب زادے......''

میں واپس ہوا۔ مولانا نے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تخت کے کونے پر ٹک گیا۔ پھر وہی آواز گرجی:

''کہاں جا رہے ہو؟''

عرض کی: جامع مسجد۔

''شعر و شاعری کی محفل آراستہ کرنے؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ پوچھا: کچھ پڑھتے پڑھاتے بھی ہو؟''

''جی نہیں۔''

مولانا نے حیرت سے اور ناگواری کی ملی جلی نظر مجھ پر ڈالی اور قدرے تلخ لہجے میں فرمایا:

''اچھا تو خالی مونچھوں ہی پر لڑ رہے ہو شیخ؟ اماں یہ تو وہی بات ہوئی کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''۔ اس کا جواب بھلا میں کیا دیتا۔ گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر تو مولانا نے انتظار کیا اور جب دیکھا کہ میں گونگی کا گڑ کھائے بیٹھا ہوں اور اُن کی بات کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے تو گویا پھٹ پڑے:

''برخوردار، سال ڈیڑھ سال سے میں دیکھ رہا ہوں دن دن بھر، بلکہ رات گئے تک جامع مسجد کے ادنیٰ اور بازاری ہوٹلوں میں بیٹھے اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ شہر کے جاہل اور کندۂ ناتراش لوگ تمہیں گھیرے رہتے ہیں اور تم اُن یتیم العقلوں کو اپنا کلام سنا سنا کر، ان کی لایعنی داد وصول کر کر کے پھولے نہیں سماتے۔ کبھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا کی ہے کہ تمہارا تعلق کس خاندان سے ہے اور اس خاندان کی روایات کیا رہی ہیں؟ آج تک اپنے بزرگوں کی دولت اور عظمت کے سہارے ان آوارہ مزاج خوشامدیوں کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے ہو۔ جانتے ہو انہوں نے کسبِ کمال کے لیے کیسی کیسی کٹھنائیاں طے کی ہیں؟ انسانیت کی خدمت کے لیے کس کس طرح اپنی جان پیلی ہے؟ یہ انہی کے علم و ہنر، انہی کے اخلاق و کردار اور انہی کی محنت اور کوشش کا صدقہ ہے کہ تم اس بے علمی و بے ہنری کے باوجود عیش و آرام اور عزت و آبرو کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تم اپنے بزرگوں کی درگاہِ عظمت کے مجاور ہو اور ان کے عقیدت مندوں کے متوسلین کے احترام و سپاس گزاری کی بنیادوں پر اپنی شرافت و فراغت کا محل تعمیر کیے بیٹھے ہو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم اپنے اسلاف کی میراث میں اضافہ کرتے۔ ان کے نام اور کام کو آگے بڑھاتے لیکن یہ رتبۂ بلند تو حضرتِ حق جل مجدہٗ کسی کسی کو عطا فرماتے ہیں۔ کم سے کم اتنا تو کرو کہ بزرگوں کی عزت کو بٹہ نہ لگے۔''

اس تقریر کے بعد مولانا نے فارسی کے چند شعر پڑھے، میری طرف دیکھا اور کہا:

''فارسی جانتے ہو؟''

''جی ہاں، تھوڑی بہت پڑھی ہے۔''

''کس سے پڑھی ہے؟''

''شروع میں ایک مولوی صاحب گھر پر پڑھاتے تھے۔ پھر دسویں جماعت تک اسکول میں پڑھی۔''

مولانا نے یہ سن کر کہا: ''تنخواہیں اور فیسیں لے کر پڑھانے والے، انسان کو حرف شناس ہی بنا سکتے ہیں۔ علم چیزے دیگر ہے جو روپے پیسے سے نہیں، خدمت اور ریاضت سے ملتی ہے۔''

مولانا عبدالسلام نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ خوش فہمی، خود فریبی اور مریضانہ احساسِ برتری کے جو پردے اب تک میرے ذہن و دماغ پر پڑے ہوئے تھے، اُن پردوں کو تار تار کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت جتنی کراہت مجھے اپنی ذات سے محسوس ہوئی، شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ میرا وجود خود میری نگاہوں میں حقیر ہو گیا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں زمین کے سینے کا بوجھ ہوں۔ باپ دادا کی عزت وعظمت کا کشکول میرے ہاتھ میں ہے اور میں گلی گلی، کوچے کوچے گدائی کرتا پھر رہا ہوں۔ مولانا کی حقیقت بیں نگاہیں میری دلی کیفیات کو تاڑ گئیں اور انہوں نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ یوں شروع کیا:

''اب بھی کچھ نہیں گیا ہے میاں صاحبزادے۔ تمہاری رگوں میں شرافت کا خون ہے۔ تمہاری غیرت سو رہی ہے مری نہیں۔ ہمت کرو تو اپنی خاندانی روایت کے قافلے کو پکڑ سکتے ہو۔''

''مولانا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا اور جو روایت انہوں نے قائم کی ہے، اس میں مقدور بھر کوئی جھول پیدا نہ ہونے دوں گا''۔ میں نے پر عزم لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی برخوردار۔ جاؤ پہلے علم حاصل کرو جو تمہاری خاندانی

روایت کی بنیاد ہے اس کے بعد عمارت خود بخود بنتی چلی جائے گی''۔ ''مولانا
......ایک درخواست ہے......'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''اگر آپ اپنے
کچھ قیمتی لمحات عنایت فرما دیا کریں......''

''کیا مضائقہ ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے طب تمہارے نانا حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم سے پڑھی ہے اور اس رشتے سے تم میرے مخدوم زادے ہو۔ اگر تم نے مجھ سے کچھ حاصل کر لیا تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی اور میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم مجھ سے پڑھ نہیں سکو گے۔''

''وہ کیوں۔''

''میرے پڑھانے کی ایک شرط ہوگی۔ جب تک تم اپنی تعلیم مکمل نہ کر لو کوئی دلچسپی، کوئی تفریحی مشغلہ، تمہارا دامن نہ پکڑے گا۔ میرا مطلب ہے کہ مجھ سے پڑھنا ہے تو شعر گوئی اور بزم آرائی اپنے اوپر حرام کرنا پڑے گی۔ تعلیم ختم کر لینے کے بعد تمہیں آزادی ہے۔ جتنے چاہو شعر کہنا اور جتنی چاہو محفلیں سجانا۔ کہو منظور ہے۔''

مولانا کی اس شرط نے مجھے ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ مجھے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ میرے ایک طرف شعر و سخن کی رنگینیاں تھیں اور دوسری طرف اس مشروط تعلیم کی تقشف آفرینیاں۔ مجھے ان دونوں میں سے ایک راستہ قبول کرنا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور دوسرا راستہ اپنے لیے منتخب کر لیا۔''

اور یوں حبیب اشعر مولوی عبدالسلام نیازی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور اپنا دامن علم کے سچے موتیوں سے بھر کر اٹھے۔ کہتے ہیں آج کی دنیا میں سب سے مشکل اور کٹھن کام انسان کی شناخت ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو انسان سے پہلے ظرفِ انساں کو دیکھ لیتے ہوں؟ موجودہ دور میں جو اخلاقی اقدار تباہ ہوئی ہیں شاید ان کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خدا نے ہم سے انسان کی شناخت چھین لی ہے۔ ہمارے بزرگ نہ صرف انسانوں کی شناخت کا فن رکھتے تھے بلکہ دعا بھی کرتے تھے کہ یا اللہ اس دنیا میں اچھے انسان بھیج۔ آدمیت اور

انسانیت الگ الگ لفظ ہیں۔ آدمیت کا مفہوم اور ہے انسانیت کا اور۔ غالب نے جب کہا تھا کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا، تو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمتہ اللہ علیہ جب کسی شخص کی کچھ زیادہ ہی تعریف کرنا چاہتے تو فرماتے: وہ نسخۂ آدمیت ہے۔ ایک عزیز دوست نے انتقال کیا تو کہا: آج آدمیت خاک میں سوگئی۔

سید سلیمان ندوی کو جب لحد میں اتارا جارہا تھا تو سفیر شام نے کتنے دردانگیز لہجے میں کہا تھا:

''اے سلیمان، تمہارے جانے کا غم نہیں۔ غم اس علم کا ہے جو تمہارے ساتھ قبر میں دفن ہو رہا ہے۔''

ہمیں حبیب اشعر کے بچھڑنے کا غم نہیں۔ ماتم اس کا ہے کہ ان کے ساتھ ایک روشن تہذیب، ایک اجلی وضع داری کی شمع بھی گل ہوگئی۔ حبیب اشعر جس خانوادے کے فرد تھے، وہ آدمیت اور انسانیت کے اعتبار سے برصغیر پاک و ہند میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے اور عوام کے دلوں اور روحوں پر ان کی حکومت تھی۔

حبیب اشعر، حکیم قاسم جان کے فرزند اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے نواسے تھے۔ حکیم اجمل خاں بخارا کے معروف صوفی بزرگ خواجہ عبیداللہ کی اولاد میں سے تھے۔ خواجہ عبید اللہ احرار کے پوتوں خواجہ ہاشم جان اور خواجہ قاسم جان کو شہنشاہ بابر اپنے ساتھ ہندوستان لایا تھا۔ تزک بابری میں بابر نے ان دونوں کا جابجا احوال لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے دل میں ان بزرگوں کا کتنا احترام تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ تیمور صاحب قرآن ایک معمولی چرواہا ہوتے ہوئے عالمگیر فاتح بن گیا۔ یہ سب حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ عرصہ دراز تک اس خاندان نے اپنی قیادت سنبھالے رکھی۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں اس خاندان کے ایک فرد اکمل خاں نے فن طبابت سیکھا اور اس وقت سے اس گھرانے میں طب کا سلسلہ جاری ہوا۔ حکیم شریف خاں حکیم صادق علی خاں، حکیم محمود خاں وغیرہ... اپنے اپنے عہد کے بہت بڑے اور نامور طبیب تھے۔ اجمل خاں، حکیم محمود خاں کے بیٹے تھے۔ حکیم شریف خاں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے عہد میں ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے

کے بعد درباری طبیب مقرر ہوئے۔ بادشاہ نے اشرف الحکماء کا خطاب دیا۔ حکیم محمد شریف خاں کی اولاد ''خاندانِ شریفی'' کے نام سے معروف ہے۔ حبیب اشعؔر اسی خاندان کے ایک گوہر آبدار تھے۔ صدیوں سے یہ خاندان مسلمانانِ ہند کی علمی اور سیاسی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور آج کل لاہور میں اس خاندان کی ایک نشانی نبیرہ حکیم اجمل خاں، حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا ہیں جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر عوام وخواص کی خدمت میں مصروف ہیں اور اعلیٰ درجے کے طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں۔

جن بزرگوں نے خاندان شریفی کے افراد کی آنکھیں دیکھی ہیں وہ گواہی دیں گے کہ ان میں سے ہر فرد ایثار، خلوص، ہمدردی، حسن اخلاق، سادگی، بے غرضی، انکسار، تواضع، بے غرضی، بردباری، محبت، شفقت، ضبطِ نفس، عفو، درگزر، عالی ظرفی، دیانت، صداقت، مستقل مزاجی، عزم صمیم، بے نیازی اور استغنا کی تصویر تھا۔ جو فرد بھی تھا اپنی جگہ ذرہ نہیں آفتاب تھا۔ حبیب اشعؔر کی شکل میں ایسا ہی ایک آفتاب چند برس قبل لاہور کی سرزمین میں غروب ہو گیا۔

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ملک کی تقسیم نے جانے کس کس کو پست سے بلند اور بلند سے پست بنا دیا بلکہ یوں کہیے کہ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ حبیب اشعؔر بھی اس ریلے میں آگئے اور ممکن تھا تنکے کی طرح بہہ جاتے لیکن انہوں نے ہر ہر مرحلے پر اپنی خاندانی وضع داری، عزتِ نفس اور غیرت کو سینے سے لگائے رکھا۔ انہوں نے روزِ اول سے اپنی جو وضع قائم کر لی تھی زندگی کے آخری سانس تک اسے نبھایا۔ جس شخص سے جس نوعیت کے تعلقات استوار تھے ان پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔ وہ سب کی پریشانیاں اور دکھ توسمیٹنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے لیکن خود انہوں نے کبھی اپنے دکھڑے کسی کے آگے نہیں روئے۔ ہر مصیبت اور ہر آفت کا خندہ پیشانی اور مردانگی سے استقبال کیا۔ معاشی حالات نے انہیں طبی مشغلوں کے ساتھ ساتھ قلم کی چکی پیسنے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے ایک مزدور بن کر قلم کو ہتھوڑے کی طرح چلایا۔ اس دوران میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوتا رہا اس کی تفصیلات بڑی دردناک ہیں اور بلاشبہ یہ حبیب اشعؔر ہی کا جگرا تھا کہ ان صدمات کو ہنس ہنس کر جھیلتا رہا مگر زبان سے شکر کے سوا کبھی کلمہ شکایت نہ نکلا۔

رنج اس بات کا مطلق نہیں کہ یہ اذیتیں انہوں نے دشمنوں کے ہاتھوں اٹھائیں۔ دشمن

ان کی ذات کا کوئی تھا ہی نہیں اور نہ وہ اپنے اندر کسی سے دشمنی کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ سب کچھ اُن کی طرف سے ہوا جنہیں وہ آخر وقت تک اپنا دوست سمجھتے رہے۔ ایسی اعلیٰ ظرفی، ایسی بلند ہمتی اور ایسی اولوالعزمی ہمارے معاشرے میں بہت کم باقی رہ گئی ہے۔ اگر وہ چاہتے تو کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ اور احترام کی ملک میں کمی نہ تھی۔ لوگوں نے اس بہتی گنگا میں کیسے کیسے اور کہاں کہاں ہاتھ نہیں دھوتے ہیں۔ حبیب اشعر کا اشارۂ ابرو کافی تھا، سب کچھ ان کے سامنے حاضر کر دیا جاتا۔ مگر میر تقی میر کی مانند دستِ سوال کسی کے آگے دراز کرنا وہ جانتے نہیں تھے۔ خوشامد، چاپلوسی سے ان کا خون آگاہ نہ تھا۔ وہ چہرے سے اپنے غم کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ جیب تنگ ہونے کے باوجود دوستوں اور مہمانوں کے لیے ان کا سینہ ہمیشہ فراغ رہا۔ وہ زندگی سے ہار ماننے والے لوگوں میں نہ تھے لیکن جس دل پر انہیں بھروسا تھا، اسی دل نے اُن سے دغا کی اور آخر کام تمام کر دیا اور وہ ایک دن چپ چاپ، کسی کو بتائے بغیر لحد کی آغوش میں چین کی نیند جا سوئے۔[ا]

اس عاجز پر ان کی شفقت اور محبت کا کیا عالم تھا، اسے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے، مگر سوچتا ہوں کیا بیان کروں۔ مادی پرستش کے اس دور میں اُن اخلاقی اقدار کی پُرسش کہاں جو حبیب اشعر اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

□□□

حاشیہ:

[ا]۔ مقبول جہانگیر کے والد کا نام منظور الٰہی تھا۔

حبیب اشعر۔ ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۹ء۔ وفات: ۱۴ جون ۱۹۷۱ء۔